مسئلہ تقدیر کا اُلٹا استعمال

(نعیم صدیقی)

جہاں علم اور اختیار آیا، سمجھیے کہ ذمہ داریوں کے پہاڑ ساتھ آئے۔ جہاں انتخاب کا حق ملا وہاں خود بخود بھلے اور برے کا سوال پیدا ہوگا، اور بھلے اور برے کا سوال پیدا ہوا تو جزا و سزا کا مسئلہ نمودار ہوگا۔ جسے قوتِ فیصلہ مل گئی وہ امتحان میں پڑ گیا اور جو امتحان میں پڑا اس کی ناکامی اور کامیابی کا دارومدار خود اس کی مساعی پر ہے۔

لیکن حضرت انسان کا حال یہ ہے کہ علم اور اختیار تو لے لیا لیکن ذمہ داریوں سے اب کتراتے ہیں۔ امتحان میں تو پڑ گئے لیکن محنت کرنے سے یہ کہہ کر گریز کرتے ہیں کہ اگر ممتحن نے چاہا تو پاس کر دیگا، اور اگر کوئی پرچہ خراب کر بیٹھیں تو ارشاد فرمائیں گے کہ ممتحن نے تو ہمارے فیل کرنے کا فیصلہ کر ہی رکھا ہے، ہمارا کیا قصور! اسی لیے قرآن میں یہ بات کہی گئی ہے کہ آدمی کو صلاحیتیں تو وہ دی گئیں کہ یہ امانتِ خلافت کو اٹھانے والا بنا، لیکن اب خواہش پرستیوں اور آرام پسندیوں کے طفیل اس امانتِ گراں بہا کی ذمہ داریوں سے گریزاں بھی ہے، سو یہ رویہ بڑا ہی ظالمانہ اور جاہلانہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی عظیم الشان سلطنت کے دستور و آئین کے جو پہلو انسان پر بذریعہ وحی والہام واضح کیے ہیں ان میں سے ایک پہلو تقدیر کا ہے۔ آخر یہ سلطنت بے چلائے نہیں چل رہی ہے بلکہ اس کے لیے کوئی منصوبہ بندیاں ہیں، کوئی نقشہ ہائے کار ہیں، کوئی پروگرام ہیں، کچھ قواعد وضوابط ہیں، اسباب اور نتائج کا ایک سسٹم ہے، موجودات کا کوئی ریکارڈ ہے، حوادث کے لیے کوئی اوقات ہیں، حرکت ہے تو اس کے پیچھے مقاصد ہیں، عمل ہے تو اس کے پیچھے علم ہے، قوانین ہیں تو اس کے پیچھے حکمت ہے، تخریب و تعمیر ہے تو اس کے پیچھے کچھ مصالح ہیں اور تصادم و کشمکش ہے تو اس کے پیچھے کوئی اصول ہیں۔ ان ساری حقیقتوں کو جب سامنے رکھ کے دیکھا

جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ذرّے ذرّے کی کوئی تقدیر ہے اور تقدیر کے بغیر ہم موجودات میں سے کسی ایک کا بھی تصور نہیں کر سکتے ۔ خَلَقَ، فَقَدَّرَ، فَهَدیٰ وہ روشن حقیقت ہے کہ جدھر نظر دوڑاؤ اُدھر ہی اس کے ثبوت بکھرے پڑے ہیں۔ خلق ہے تو قدر ہے، قدر ہے تو ہدایت ہے۔

اگر خالق کو خالق ماننے کے بعد تقدیر ساز اور ہادی نہ مانا جائے تو ایک ایسے ناقص خالق کا تصور حاصل ہوتا ہے کہ پھر اسے خالق ماننا مشکل ہو جاتا ہے۔ جو خلق کرے اور اندھا دھند کرے جس کے سامنے کوئی اسکیم نہ ہو، جو قوتوں کی تقسیم کے لیے کوئی خاص پیمانہ نہ رکھتا ہو، جس کی عنایتوں اور جس کی قہر مانیوں کے لیے کوئی خاص اصول نہ ہو، جو ذات کی تحدید نہ کرے، جو خزانوں کا احاطہ نہ رکھتا ہو، جو مخلوق کے علم سے کورا ہو وہ ایک ذہنی بُت تو ہو سکتا ہے، خدا نہیں ہو سکتا۔

لیکن اسی تقدیری نظام کی حدبندیوں کے اندر اُس کی تقدیر نے ہی انسان کو خلافت کا مقام دیتے ہوئے علم و اختیار سے نوازا ہے۔ اس کے لیے قدم قدم پر دو راہے بنا دیے ہیں، وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ! اسے خیر و شر کی قوتِ تمیز بھی دی ہے اور الہام کی روشنی بھی دی ہے کہ وہ جدھر قدم بڑھائے علم کے ساتھ بڑھائے: فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۔ پھر اسے آزادی دی ہے کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۔ جی چاہے تو ایمان کا راستہ اختیار کرے اور جی چاہے تو کفر کی راہ پسند کرے۔

انسانی زندگی کی حالت کائنات میں ویسی ہی ہے جیسی کسی ریاست میں ایک نیم خود مختار (Autonomous) صوبائی یونٹ کی ہو۔ اس خود مختاری کی حدود جہاں تک وسیع ہیں وہاں تک آدمی جو چاہے کر گزرے، لیکن کچھ دور جا کر یہ حدود ختم ہو جاتی ہیں اور جبریت کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ اس سرحد کے باہر آدمی چاہے جو بھی جتن کرے وہ اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے کچھ نہیں کر سکتا۔ یہاں بر بنائے دستور جو محدود آزادی اسے حاصل ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔

جبر و اختیار کی دو حیثیتوں کے اس طرح جمع ہو جانے سے کوتہ نظر لوگ ہمیشہ بڑی الجھنوں

میں پڑے ہیں۔ جس کسی نے اپنے اختیار کا غیر معمولی مطالعہ کیا اس کی نگاہ سے جبر کا پہلو اوجھل ہوگیا، اور جس نے جبریت کا راز پالیا اس کی نگاہ اختیار سے ہٹ گئی۔ پھر بارہا ایسا ہوا ہے کہ جبریت کے مظاہر کو لوگوں نے اختیار کے مظاہر سے ٹکرانے کی کوشش کی ہے اور ایک پہلو کے ماننے والوں نے دوسرے پہلو کی نفی کو لازم قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ پورا نظامِ جبریت اُس اختیار کی نفی نہیں کرتا جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیا ہے، جسے ہم روزمرہ زندگی میں محسوس کرتے ہیں اور جس کو صراحتہً اللہ نے اپنے انبیاء کے ذریعے بیان کیا ہے۔ اسی طرح ہمارا پورا دائرۂ اختیارات اُس نظامِ جبریت کو باطل نہیں کرسکتا جسے مانے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں اور جسے خود اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے بے نقاب کیا ہے۔

لیکن جہاں تک محض اختیار کے دعوے کا تعلق ہے اسے لے کر جو بھی اُٹھے اسے جبریت کی لہروں کے چند ہی تھپیڑے اصل حقیقت سے آشنا کردیں گے۔ بخلاف اس کے جب لوگ محض جبریت کے مدعی بنتے ہیں تو اس چکر سے نکلنا مشکل ہوجاتا ہے۔ جبریتِ تام اور اختیار کی کلی نفی کی طرف بالعموم وہ لوگ جاتے ہیں جو بہ حیثیتِ انسان اپنی فطری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ناکام رہتے ہیں اور جن کے لیے اپنی خواہشات اور میلانات کی غلامی سے نکلنا بڑا شاق ہوتا ہے۔

ذمہ داریوں سے گریز کرنے والوں کو جتنی اچھی پناہ گاہ جبریت کے فلسفے میں حاصل ہوتی ہے اتنی کسی اور طرح حاصل نہیں ہوتی۔

چنانچہ اقامتِ دین کی دعوت کے علمبرداروں کو اس کا خوب اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ اس دعوت کے راستے میں فلسفۂ جبریت بعض اوقات بری طرح روک بنتا ہے اور یہ خواص سے لے کر عامیوں تک یکساں سرایت کیے ہوئے ہے۔ آپ لوگوں سے کہیے کہ غلبۂ دین کے لیے کچھ کرو تو جواب ملے گا کہ یہ سب کچھ تو اللہ کے بس میں ہے، جب تک اس نے دین کی مخالف طاقتوں کو سرفرازی دے رکھی ہے، کون ہے جو اس سرفرازی کو پستی سے بدل سکے۔ اور جب

تبدیلی کا وہ وقت آئے گا تو خود بخود اس کے سامان ہو جائیں گے! وہی بات کہ ؎

تن بہ تقدیر ہے آج اُن کے عمل کا انداز

تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

بڑے بڑے مجرموں سے بات کیجیے تو وہ فوراً اپنی ذمہ داری "قسمت" کے سر ڈال دیں گے۔ ان کے خیالات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو خلاصہ یہ نکلے گا کہ ہم از خود تو جرم کرنا نہیں چاہتے بلکہ نیک بن کر رہنے ہی کو پسند کرتے ہیں مگر خدا تعالیٰ نے ہمیں بالکل مجبور کر دیا ہے کہ ہم جرم کریں، لہٰذا اصلاح کا اگر ہم ارادہ بھی کریں اور اس کے لیے سعی بھی کریں تو رائگاں ہے۔ جیسا کہ حافظ نے کہا تھا ؎

درکوئے نیک نامی ما را گذر نہ دادند

گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

یعنی انسانی زندگی کے نیم مختار (Autonomous) صوبے کا حکمران صوبے کا نظم و نسق ٹھیک سے نہیں چلاتا۔ اعلیٰ محلوں میں وقت گذارتا ہے، عیاشیاں کرتا ہے، دشمنوں کی مدافعت کا سامان نہیں کرتا، رعایا کی خبر گیری کا حق ادا نہیں کرتا، لیکن جب پوچھتے ہیں کہ تاج و تخت کی گراں بار ذمہ داریاں سر لے کر یہ کیا حال بنا رکھا ہے جناب نے؟ تو ارشاد ہوگا کہ دراصل یہ سب کچھ جو میں کر رہا ہوں یہ مرکزی حکومت کے خفیہ اثرات کے تحت کر رہا ہوں، میرا تو کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔ بھلا کہاں بادشاہ سلامت اور کہاں مجھ جیسا ایک ناچیز والئ ریاست! اختیار تو بادشاہ کا ہے، والئ ریاست تو بس یونہی آلۂ کار ہوتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس طرح کی باتیں ہمیشہ اونچے درجے کی دینی و اخلاقی ذمہ داریوں کی دعوت کے جواب میں تو کہی جاتی ہیں، لیکن اپنی دن رات کی زندگی میں کوئی بھی جبریت کے فلسفے پر تکیہ نہیں کرتا۔ ہمارے ایک دوست، اس دعوت کے جواب میں کہ اپنی زندگی بدلیے، فرمانے لگے کہ اس میں ہمارا کیا اختیار، یہ تو خدا کی طرف سے ازل کے دن لکھا گیا تھا۔ اس پر ان

سے عرض کیا گیا کہ آپ کا بچہ جب بیمار ہو جاتا ہے تو آپ رات کو سردی میں گرم بستر چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں، جتن سے بہتر ڈاکٹر کو تلاش کر کے لاتے ہیں اور بہتر سے بہتر دوائیں اپنا مال خرچ کر کے حاصل کرتے ہیں، پھر تیمارداری میں اپنا آرام قربان کرتے ہیں ــــ اس سارے سلسلہ میں تو آپ کو کبھی فلسفۂ جبریت یاد نہیں آتا اور کبھی آپ یوں نہیں سوچتے کہ بیماری اور صحت تو خدا نے پہلے ہی لکھ دی ہے پھر ہم کیوں علاج کے چکر میں پڑیں، مگر بس جہاں خدا کے دین کا کوئی مطالبہ سامنے آیا تو آپ نے جبریت کے فلسفہ کو عذر میں پیش کر دیا۔ اگر آپ بے روزگار ہو جائیں تو در در جا کر روزگار تلاش کریں، سفارشیں لے کے دفتروں میں گھومیں، ایک ایک کی منت سماجت کریں، ادھر اُدھر سے معلومات حاصل کریں۔ گھر میں آٹا ختم ہو جائے تو کہیں سے اُدھار لے کر بھی آٹا خرید لائیں۔ کوئی آپ کی عزتِ نفس پر حملہ کر دے تو دماغ اور زبان اور ہاتھ پاؤں کی ساری قوتیں انتقام میں لگا دیں۔ کوئی آپ کا مال مار کھائے تو اس کے خلاف مقدمہ لڑنے کے لیے اپنی سی جو کچھ کر سکتے ہوں کر گذریں۔ ان معاملات میں تو کبھی تقدیر کا سوال پیدا نہ ہو۔ لیکن بات جب خدا و رسول کے احکام کی اطاعت کی آئے اور حمایتِ دین کے لیے آپ کو پکارا جائے تو آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ روزِ اول سے یہ معاملات طے ہو چکے، اب سوچنا کیسا اور کوشش کیسی؟ یا دونوں طرف جبریت کے آگے سر جھکائیے، یا دونوں طرف سعی کا حق ادا کیجیے۔ یہ کیا کہ اپنی خواہشات ہوں تو آپ ہمہ تن اختیار بن جائیں اور خدا و رسول کا حکم سامنے آئے تو جبریت کی پناہ گاہ میں جا چھپیں! براہِ کرم اس فریبِ نفس سے نکلیے!

یہ سن کر وہ بالکل لاجواب ہو گئے۔

تقدیر جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داریوں کا دوسرا نام ہے، اور شریعت بندوں کی ذمہ داریوں کی وضاحت ہے اور یہ وضاحت بھی خود اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔ لیکن وہ بندے عجیب بندے ہوتے ہیں جو اپنی ذمہ داریوں سے تو بھاگتے ہیں لیکن خدا کی ذمہ داریوں پر بحث کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح اپنی ساری ذمہ داریاں بھی اُٹھا کر خدا کے سر ڈال دیں تاکہ ان کے سر کوئی ذمہ داری باقی نہ رہے۔

مسئلہ تقدیر کے بیان کا مقصد قرآن میں مسئلہ تقدیر کے جو پہلو بے نقاب کیے گئے ہیں وہ محض اسرار بیانی کے طور پر نہیں کیے گئے ہیں۔ بلکہ ان کا ایک مقصد ہے اور ان کا مقصد وہی ہے جو پورے قرآن کا مقصد ہے ـــــ یعنی بندوں کو اللہ پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت پر آمادہ کرنا؛

آپ ذرا غور و فکر سے کام لیں تو یہ بات باور کرنے کے لیے آپ کی عقل ہرگز تیار نہ ہوگی کہ جس قرآن کا مدعا ایمان و اطاعت پر آمادہ کرنا ہو وہ کچھ ایسے نکتے بھی بیان کرے گا جو ایمان سے فرار میں مدد دینے والے ہوں یا جن سے طاعت کا رجحان ہی ختم ہو جائے اور جذبات ہی سرد پڑ جائیں۔ پس جبریت مطلقہ کے قائلین جس طرز پر اپنے من گھڑت فلسفے کو طاعت سے گریز کرنے کے لیے دلیل بناتے ہیں وہ قرآنی منشا کے بالکل خلاف ہونا چاہیے۔ یہ جبریت محضہ کی دلیل تو تمام انبیا کی بعثت اور تمام کتب آسمانی کے نزول اور تمام ہجرتوں اور تمام جہادوں اور شہادتوں اور مالی و جانی قربانیوں کو جو دین کی راہ میں کی گئیں بالکل بے کار اور فضول بنا کے رکھ دیتی ہے۔ جب اللہ بالجبر لوگوں سے نیکی اور بدی کرا رہا ہو تو دعوتِ حق کے کیا معنی؟ کفر و دین، فسق و تقویٰ اور معروف و منکر کی تقسیم کا کیا مطلب؟ انبیاء کو کھڑا کرنے کا کیا فائدہ؟ اور کتابیں نازل کرنے کا کیا مقصد؟ یہ فلسفہ تو گویا اللہ میاں پر بہتان باندھنا ہے کہ نعوذ باللہ، وہ تضاد کار اور لایعنی کام کرنے والے ہیں۔

پس لازم ہے کہ قرآن کا فلسفۂ تقدیر سراسر طاعت و تقویٰ کی طرف لے جانے والا ہو، نہ کہ اس سے فرار کے چور دروازے کھولنے والا۔ آپ اُن سارے مقامات کا جائزہ لیں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیار، اپنی مشیت، اپنی جبّاری و قہاری، اپنے تسلط اور غیر محدود علم و قدرت کا ذکر کیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ جہاں کہیں جبریت کی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہاں یا تو لوگوں کو کسی معصیت سے ہٹانا مطلوب ہے یا کسی طاعت کی طرف بلانا مطلوب ہے۔

قرآن میں تقدیر کا بیان شریعت سے بے نیاز ہونے کے لیے نہیں بلکہ شریعت کا پابند بنانے کے لیے آیا ہے۔ خدا کی مشیت کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ اس کی رضا کی پیروی چھوڑ دینے کے لیے اور شیطان کا دامن تھام لینے کے لیے لوگوں کو ایک دلیل مل جائے بلکہ اس لیے کیا گیا ہے کہ انسان

اللہ کی رضا کے پیچھے چلنے ہی کو اپنے لیے لازم سمجھے۔ وہاں منشا یہ ہے کہ لوگ بدی سے مضبوط ہو کر لڑ سکیں اور یہاں اثر یہ لیا گیا کہ اُلٹا مجاہدین بدی کے سامنے ہتھیار ڈال کے پڑ رہیں! کیسا دلچسپ ماجرا ہے کہ قرآن نے فلسفۂ تقدیر کو جس مدعا کے لیے استعمال کیا ہے دنیا اس کے بالکل الٹ استعمال کرتی ہے۔

آئیے ذرا قرآن کو ملاحظہ کیجیے:

ذکرِ تقدیر برائے عزمِ صمیم | سورۂ انعام میں نبی صلعم کی زبان سے یہ اعلان کرایا جاتا ہے کہ:-

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الذین تدعون من دون اللہ ط قل لا اتبع اھواءکم لا قد ضللت اذاً و ما انا من المھتدین ۝

اے محمدؐ! اعلان کر دیجیے کہ مجھے اس بات سے منع کر دیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو۔ کہہ دیجیے کہ میں تمہاری خواہشوں کی پیروی نہیں کر سکتا۔ اگر میں ایسا کرتا تو راہِ حق سے بھٹک گیا ہوتا اور میں ہدایت پانے والوں میں سے نہ ہوتا۔

قل انی علیٰ بینۃ من ربی و کذبتم بہ ط ما عندی ما تستعجلون بہ ط ان الحکم الا للہ ط یقص الحق و ھو خیر الفاصلین ۔ قل لو عندی ما تستعجلون بہ لَقُضِیَ الامر بینی و بینکم ط و اللہ اعلم بالظلمین ۔

کہہ دیجیے کہ میں اپنے آقا کی طرف سے ایک روشن دلیل پر قائم ہوں لیکن تم نے اسے جھٹلا دیا ہے میرے بس میں وہ کچھ (یعنی عذاب) ہے ہی نہیں جس کے لیے تم جلد بازی کر رہے ہو۔ اللہ کے سوا کسی اور کو فیصلہ دینے کا اختیار نہیں ہے۔ وہ حق کو بیان کر دیتا ہے اور (پھر جو نہ مانے اس کے لیے) وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہہ دیجیے کہ اگر میرے بس میں وہ کچھ ہوتا جس کے لیے تم جلد بازی کر رہے ہو تو میرے تمہارے درمیان اس جھگڑے کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا۔ — اور اللہ خود ظالموں کو (اور ان کے لیے عذاب بھیجنے کے موقع کو) خوب جاننے والا ہے۔

یہ اعلان اپنے ماحول میں طوفان کی ایک لہر سے کم نہ ہوگا۔ مخالفین حق کی کثیر تعداد کے سامنے اس دو ٹوک طریق سے اپنے عزم کو کہہ دینا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا تھا اور اس کے نتائج جو ممکن تھے وہ ایک ایک مسلمان کے سامنے تھے۔ اس موقع پر نظام تقدیر کی طرف کچھ اشارات یوں کیے گئے :۔

وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو ط ویعلم ما فی البر والبحر ط وما تسقط من ورقۃ الا یعلمھا ولا حبۃ فی ظلمت الارض ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین ۔

(الانعام - رکوع ۷)

اور غیب (کے خزانہ ہائے اسرار) کی کنجیاں اسی کے قبضے میں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی جانتا ہی نہیں اور جو کچھ بحر و بر میں ہے اس کو وہ جانتا ہے اور کوئی پتہ تک بغیر اس کے نہیں گرتا کہ اسے اس کا علم ہو۔ اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ایسا ہے اور نہ کوئی خشک و تر ایسا ہے کہ جو ایک صاف صاف لکھی ہوئی کتاب میں (درج) نہ ہو۔

اللہ کی قدرت اور اس کی صفات کا یہ بیان محض برائے وزن بیت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طرف اپنے اندر کفار کے لیے دھمکی لیے ہوئے ہے، دوسری طرف اس میں اللہ کے آگے جھکنے کی دعوت مخفی ہے، اور تیسری طرف اس کا منشا نبی صلعم اور مومنین کے اس عزم کی پشت پناہی کرنا ہے جسے اوپر کی آیات میں مخالفین حق کے سامنے کھول کے رکھ دیا گیا ہے۔ یہ ٹکڑا اس اعلان کے نتیجے میں نمودار ہونے والے حوادث میں نبی صلعم اور آپ کے پیروؤں کے لیے بہترین سامان استقامت ہے۔

ذکر تقدیر برائے استقامت خدا کو رب مان لینا یوں تو سستا کھیل ہے، لیکن جب خدا کو رب ماننے سے مصنوعی رب بگڑتے ہیں تو پھر قدم جما کے کھڑا ہونا ہر آدمی کا کام نہیں رہتا۔ قرآن میں اہل ایمان کو آزمائشوں کے مقابلے میں درس استقامت دیتے ہوئے بھی تقدیر کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔

مثلاً سورۂ عنکبوت کا موضوع ہی آزمائش میں استقامت کی تعلیم ہے۔ آغازِ کلام یوں ہوتا ہے کہ: احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا اٰمنا وھم لا یفتنون ۝ ولقد فتنّا الذین من قبلھم فلیعلمنّ اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکٰذبین ۝ (۲-۳) پھر آگے چلیے تو آتا ہے: ومن الناس من یقول اٰمنا باللہ فاذا اُوذی فی اللہ جعل فتنۃ الناس کعذاب اللہ (۱۰)

اِس سلسلۂ بیان میں تقدیر کی حقیقتیں یوں بے نقاب کی جاتی ہیں:-

(۱) کل نفس ذائقۃ الموت ثم الینا ترجعون ۝ (۵۷)	(ہر جاندار کی تقدیر یہ ہے کہ وہ) موت کا لقمہ بننے والی ہے، پھر تم (حساب کے لیے) ہمارے پاس لوٹائے جاؤ گے۔
(۲) وکاین من دآبۃ لا تحمل رزقھا ج اللہ یرزقھا وایاکم ج وھو السمیع العلیم (۶۰)	اور کتنے ہی جاندار (تمہارے سامنے) ہیں کہ اپنا رزق (اپنی پیٹھ پر) لادے نہیں پھرتے۔ اللہ ہی ان سب کو رزق دیتا ہے اور تم کو بھی! اور وہ تمہارے (مطالبوں کو) سننے والا اور (تمہاری ضروریات کو) جاننے والا ہے۔
(۳) اللہ یبسط الرزق لمن یشآء من عبادہ ویقدر لہ ج ان اللہ بکل شیئ علیم ۝ (۶۲)	اللہ اپنے بندوں میں سے جس کسی کے لیے چاہتا ہے رزق کو وسیع کر دیتا ہے اور (جو چاہتا ہے تو) سکیڑ دیتا ہے۔ اور یقیناً وہ (رزق کے اس نظام سے تعلق رکھنے والی) ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

یہاں اس بیان کا صاف مقصد یہ ہے کہ موت سے خوف کھانا چھوڑ دو، یہ تو آنی ہے، فکر کرو تو اس کی کہ موت کے بعد خدا کے سامنے حساب کے لیے پیش ہوگے تو اُس وقت کیا ان لوگوں میں شامل ہونا چاہتے ہو جو موت سے ڈر کر حق سے ہٹ گئے یا ان لوگوں میں جنہوں نے حق کے لیے متاعِ جان بھی بازی میں لگا دی؟ دوسری بات یہ سمجھائی گئی کہ یہ کاوش کرنا بھی چھوڑ دو

کہ گھر بار اور روزگار تم سے چھوٹ جائیں گے۔ ان سارے حالات کے باوجود اللہ تم کو رزق دینے والا ہے جس طرح وہ تمہارے سامنے ہر جاندار کو دے رہا ہے۔ یہ اسی کے اختیار میں ہے کہ کسی کو کم دے اور کسی کو زیادہ دے۔ پس تم رزق کی تنگی کے اندیشے سے حق سے انحراف نہ کرنا۔

اب دیکھیے کہ یہاں تقدیر کا بیان صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ اہل ایمان حق کی حمایت و نصرت اور استقامت کی ذمہ داریوں میں کوتاہی نہ کریں۔

بالکل اسی مقصد کے لیے مسئلہ تقدیر ایک دوسرے موقع پر بھی بیان ہوا ہے۔ وہاں بھی ایک چیلنج کے انداز میں نبی صلعم سے دینِ توحید پر عزم صمیم کا اظہار کرایا جاتا ہے کہ قل یا ایھا الناس ان کنتم فی شك من دینی فلا اعبد الذین تعبدون من دون الله ولکن اعبد الله الذی یتوفٰکم ج وامرت ان اکون من المؤمنین ٥ - پھر یہ حکم اور تنبیہ کی کہ: وَاَقِمْ وجھك للدین حنیفًا ج ولا تکونن من المشرکین ٥ ولا تدعُ من دون الله مالا ینفعُكَ ولا یضرُّك ج فان فعلت فانك اذًا لّمن الظالمین ٥

ذرا محسوس کیجیے کہ یہ مقام کیا ہے؟ حکم ہوا ہے کہ صاف صاف کہہ دو کہ اگر کسی کو پہلے کوئی شبہ تھا تو وہ آج سُن لے کہ مَیں اللہ کے سوا تمہارے معبودوں کی عبادت کرنے پر کبھی تیار نہیں ہوں۔ پھر مطالبہ ہے کہ دین کی طرف یکسوئی کے ساتھ رُخ کر لو!

یہ کہتے ہوئے آنے والی آزمائشوں کے بارے میں اطمینان دلایا کہ اللہ کے سوا جو طاقتیں بھی ہیں وہ "لا ینفعك" اور "لا یضرك" کے درجے میں ہیں۔ پھر مثبت طور پر اپنے کامل اختیارات کو اللہ نے بیان فرمایا کہ:-

وان یَمْسَسْكَ بِضُرٍّ فلا کاشف لَهٗ الا ھو ج وان یُرِدْكَ بخیرٍ فلا رآدّ لِفضلہٖ ط

اگر وہ (اللہ) تم کو کوئی نقصان پہنچائے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں کہ جو اس سے نجات دلا سکے، اور اگر وہ تمہارے لیے کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو پھر اس کے فضل کو روکنے والا بھی کوئی نہیں۔

یہ ہے وہ زریں عزم وثبات اور یہ ہے وہ حظِ استقامت! ــــ لیکن یاروں نے اس سے بزدلی، جمود، بے حسی اور بے حمیتی کے جواز کے لیے طرح طرح کے نکتے نکال لیے!

حق کی طرف پیشقدمی کا درس سورۂ الحدید میں جو آیت مغفرت ربی اور ارض وسما جیسی وسیع جنت کی طرف پیش قدمی کرنے کا جرس بجاتی ہے اسے ملاحظہ کیجیے۔ فرمایا "سابقوا الیٰ مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضھا کعرض السمآء والارض" اور پھر متصلاً نظامِ تقدیر کا ذکر کیا تاکہ ان وادیوں میں پیشقدمی کرنے والوں کو جو مہالک خوفزدہ کر سکتے ہیں ان کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ یہ سب کچھ اللہ کے بس میں ہیں اور وہ بہر حال اپنی طرف آنے والوں کا خود پاسبان ہے۔ کیا ہی تسکین بخش الفاظ ہیں:-

ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتٰب من قبل ان نبرأھا ان ذالک علی اللہ لیسیر ۝	کوئی مصیبت ایسی نہیں کہ جو تم کو زمین میں پہنچے یا خود تمہاری جانوں کو پہنچے، مگر وہ اس سے قبل کہ وجود میں آئے ہمارے نوشتہ میں لکھی ہوئی ہوگی، اور یہ صورت (کہ ایک شے کے وجود میں لانے سے قبل

اس کی تقدیر کا پورا پورا علم اللہ کو ہو) اللہ کے لیے بہت ہی آسان ہے،

لیجیے، یہاں اس حقیقتِ تقدیر کی وضاحت کا مقصد بھی سن لیجیے:

لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتٰکم	(یہ وضاحت اس لئے ہے) کہ تم جو کچھ ہاتھ سے جائے اس پر افسوس نہ کرو اور جو کچھ تمہیں حاصل ہو اس پر اکڑ نہ جاؤ۔

بس یہ الفاظ ہیں جو حقیقتِ تقدیر کے قرآن میں بیان کیے جانے کا مقصد واضح کرتے ہیں (آل عمران میں بھی یہی بات دُہرائی گئی ہے) تعلیم یہ دی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی جنت رضا کی طرف جو لوگ اقدام کرنے کا فیصلہ کریں اُن کے لیے لازم ہے کہ وہ اطاعت کے مقامات سے گذرتے ہوئے ہر نقصان کے غم سے اور ہر فائدے پر اکڑنے سے پاک رہیں ورنہ نقصانات کے افسوس میں اگر وہ بگڑ گئے یا فوائد کے نشے میں آ گئے تو طاعت کا دامن چھوٹ جائیگا۔ اس مقامِ استقامت حقیقت پر جانے کیلیے مسلمانوں کو تقدیر کے چہرے سے نقاب اٹھا کر اس کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے کہ نفع و نقصان اللہ کی طرف سے ہیں، ایک منصوبے کے تحت ہیں، ایک حکمت کی بنیاد پر ہیں، اٹل ہیں، اور حق پر چلو یا باطل پر، ان وادیوں سے ہو کر نکلے بغیر تمہارے لیے کوئی چارہ نہیں۔ (باقی)